حرف حرف روشنی

حمایت علی شاعر

المصنفین
پاکستان

(جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں)

ہندوستانی ایڈیشن
زیرِ اہتمام
(مکتبہ جامعہ، نئی دہلی)

حرف حرف روشنی

پاکستانی ایڈیشن

جولائی ۱۹۸۹ء

تزئین   اوج کمال

المصنفین
سی ۔ بی ۴۵ الفلاح سوسائٹی
کراچی ۲۵

والدۂ مرحومہ

محترمہ لُطف النساء بیگم کے نام

بچپن کا ایک خواب، جو اب یاد بھی نہیں

حمایت علی شاعر

والدہ کے انتقال کے وقت حمایت علی شاعر کی عمر تین سال تھی

سودا جو بے خبر ہے کوئی، وہ کرے ہے عیش
مشکل بہت ہے اُن کو جو رکھتے ہیں آگہی

ترتیب

حرفِ مختصر ۹

ثلاثی (ایک نئی صنفِ سخن)

الہام	شاعری	اسلوب	۱۳
علم	حرفِ آخر	اساس	۱۴
یقین	زاویۂ نگاہ	انکشاف	۱۵
ارتقاء	دسترس	مابعد الطبیعیات	۱۶
زندگی	انتباہ	ارتفاع	۱۷
شرط	جدلیات	تناسخ	۱۸
دوسرا رُخ	خوش فہمی	بے کسی	۱۹
دانشور	ابن الوقت	کرسی	۲۰
نمائش	رویتِ ہلال	کششِ ثقل	۲۱

غزل

میں سوچتا ہوں مگر میری سوچ ہی کیا ہے ۲۵
بدن پہ پیرہن خاک کے سوا کیا ہے ۲۶
حیراں نہ ہو یہ زہر ہے اپنی ہی کشت کا ۲۸
دستک ہوا نے دی ہے ذرا غور سے سنو ۲۹
میں وہ یقیں ہوں نظر آئے جو گماں کی طرح ۳۱
اس دشت پہ احساں نہ کر اے ابرِ رواں اور ۳۲
لُٹا دیا ہے غم آب و تاب میں کیا کیا ۳۳
آنکھ کی قسمت ہے اب بہتا سمندر دیکھنا ۳۵
کب تک رہوں میں خوف زدہ اپنے آپ سے ۳۷
رات سنسان، دشت و در خاموش ۳۸
ٹوٹا نہیں بکھر کے بھی خوابِ جنوں ہنوز ۴۰
یہ بات تو نہیں ہے کہ میں کم سواد تھا ۴۲
منزل کے خواب دیکھتے ہیں پاؤں کاٹ کے ۴۳
جب تک زمیں پہ رینگتے سائے رہیں گے ہم ۴۴
رُکتا ہے اُجالا کہیں ظلمت کی سپر سے ۴۵
اہلِ دل، اہلِ خرد، اہلِ نظر سب سو گئے ۴۶
آج کی شب جیسے بھی ہو ممکن جاگتے رہنا ۴۷
ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ ۴۸
نہ جانے اہلِ نشیمن پہ کیا گھڑی آئی ۴۹
اب بتاؤ جائے گی زندگی کہاں یارو ۵۰
اک سنگِ دل کا پھر ہے مقدر بنا ہوا ۵۲
جو کچھ بھی گزرنا ہے مرے دل پہ گزر جائے ۵۴
جس کو دیکھ کے شاعر تم للچائے بہت ۵۶
یہ آرزو ہے کہ جب بھی گلے لگاؤں اُسے ۵۸
میں جو کچھ سوچتا ہوں اب تمھیں بھی سوچنا ہوگا ۶۰
اس دشتِ سخن میں کوئی کیا پھول کھلائے ۶۱

نظم

آئینہ در آئینہ ۶۵
پا بہ گِل ۶۶
سمندر اور انسان ۶۸
جواب ۶۹
اندیشہ ۷۰
بگولا ۷۱
ایک منظر ۷۳
آگ میں پھول ۷۴
گوسالہ ۷۵
لمحۂ فکر ۷۷
پسِ دیوارِ حرف ۷۹
موہن جو دڑو میں دوسرا آدمی ۸۳
مریم سے ایک سوال ۸۵
پُرانے سلسلے نئے رابطے ۸۸
ہارون کی آواز ۹۱
یوسفِ ثانی ۹۴

مادرِ وطن کا نوحہ ۹۵
کاش! ۹۶
پرتو ۹۷
ان کہی ۹۹
غمِ حاصل ۱۰۲
چل خسروِ گھر اپنے ۱۰۶
مدّت کے بعد ۱۰۸
حریفِ وصال ۱۱۱
دوسرا تجربہ ۱۱۴
منظر و پس منظر ۱۱۶
حرف حرف روشنی (ایک طویل نظم) ۱۲۳

حرفِ مختصر

(ہندوستانی ایڈیشن کا پیش لفظ)

"حرف حرف روشنی" میرے تین شعری مجموعوں "آگ میں پھول" "مٹی کا قرض" اور "ہارون کی آواز" کا مختصر انتخاب ہے۔ چوتھا مجموعہ "تشنگی کا سفر" طویل تمثیلی اور افسانوی نظموں پر مشتمل ہے اس کتاب کی ایک طویل ترین نظم "بنگال سے کوریا تک" کا انگریزی ترجمہ Flower in Flames کے نام سے ہندستان میں شائع ہو چکا ہے۔ (ترجمہ نگار: پروفیسر راجندر سنگھ ورما) اور یہ نظم ۱۹۵۴ء میں سالنامہ "شاہراہ" (دہلی) کے علاوہ ۱۹۶۲ء میں ساہتیہ اکیڈیمی آندھرا پردیش کے زیرِ اہتمام شائع کردہ کتاب "حیدرآباد کے شاعر" (جلد دوم۔ مرتبہ: سلیمان اریب) میں بھی شامل ہے۔ اس لیے میں نے "تشنگی کا سفر" کی بجائے تازہ مجموعۂ کلام "ہارون کی آواز" سے ایک طویل نظم "حرف حرف روشنی" منتخب کرلی —— اور اب یہی عنوان اس کتاب کا نام ہے۔

اپنے کلام کو منتخب کرتے وقت یہ بات میرے پیشِ نظر رہی کہ قارئین کی نظر میں میری فکر اور میرے فن کے ارتقائی مدارج کا ایک گراف بھی بنتا جائے لیکن حدود ضخامت کے سبب موضوعات کا وہ تنوّع جو زندگی کی طرح شاعری کو بھی ہمہ رنگ بناتا ہے، شاید زیادہ نمایاں نہ ہوسکے اور اسلوب کی وہ اکائی بھی متعیّن نہ ہوسکے جو ایک زاویے سے شاعر کی پہچان بن جاتی ہے۔

اسلوب کی انفرادیت اہم ضرور ہوتی ہے مگر اس حد تک نہیں کہ اس کی تلاش میں شاعری کا سفر، گردِ سفر میں گم ہو کر رہ جائے اور شعر کا معنوی رشتہ اپنے عہد سے کٹ جائے۔ میرے نزدیک شاعری، زندگی کے تنقیدی ادراک سے بھی عبارت ہے اور اس ادراک کے سوتے تاریخ و تہذیب کے جدلیاتی عمل اور اس کے نتائج میں اپنے عہد کے سائنٹفک تجزیے

سے پھوٹتے ہیں اور شاعر اس آگہی کا ابلاغ شعر کی زبان میں فراہم کرتا ہے۔ علامت و استعارہ اسی ابلاغ کے وسیلے ہیں۔ اگر یہ وسیلہ اس قدر ذاتی اور داخلی ہو جائے کہ اپنے آئینے میں، اپنی ہی شکل پہچانی نہ جا سکے تو شاعری بے چہرہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہمارے دور میں جدیدیت ایک ایسے ہی المیے سے دوچار ہے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ میرا آئینہ پتھر نہ بن سکے۔ اس آئینے میں چہرہ بہ چہرہ وہ تسلسل برقرار رہے جو روایت میں جدت کا ضامن ہوتا ہے۔

میری شاعری میں یہ التزام کس حد تک رچ سکا — اس کا اندازہ اہل نظر ہی لگا سکتے ہیں اور بالخصوص اُس نئی صنف میں جسے میں نے مثلث کی رعایت سے "ثلاثی" کا نام دیا ہے۔ "ثلاثیاں" میں ۱۹۶۰ء سے کہہ رہا ہوں۔ پہلے اس کا نام تثلیث رکھا تھا مگر ایک مذہبی نظریے کی اصطلاح سے مناسبت پیدا ہو جانے کے سبب بہت جلد اسے ترک کر دیا اور اب "ثلاثی" ہی کے نام سے یہ صنف موسوم ہے۔ ہیئت اور فن کے اعتبار سے میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوں — اس کا فیصلہ بھی اہل ادب کریں گے۔

آخر میں مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر شاہد علی خاں صاحب کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جن کی فرمایش پر یہ انتخاب عمل میں آیا اور میرے قیام کے دوران ہی طباعت سے آراستہ ہو کر قارئین تک پہنچ گیا۔ اُن کی یہ مساعی اور حُسنِ انتظام بلاشبہ قابلِ رشک ہے۔

حمایت علی شاعر

ایوانِ غالب
ماتا سندری لین۔ نئی دہلی

ثلاثی

(ایک نئی صنفِ سخن)

الہام

کوئی تازہ شعر، اے ربِ جلیل
ذہن کے غارِ حرا میں کب سے ہے
مگر — محوِ انتظارِ جبرئیل

شاعری

ہر موجِ بحر میں کئی طوفاں ہیں مشتعل
پھر بھی رواں ہوں ساحلِ بے نام کی طرف
لفظوں کی کشتیوں میں سجائے، متاعِ دل

اسلوب

کس طرح تراش کر سجائیں
نادیدہ خیال کے بدن پر
لفظوں کی سِلی ہوئی قبائیں

علم

مرنا ہے تو دُنیا میں تماشا کوئی کر جا
جینا ہے تو اس گوشۂ تنہائی میں اے دل
معنی کی طرح لفظ کے سینے میں اُتر جا

اساس

کب ہوا کی کوئی تحریر نظر میں آئی
گر زمیں ہو، تو ہر اک بیج میں امکانِ شجر
بے زمیں ہو، تو ہر اک نقشِ نمو ہے — کائی

حرفِ آخر

ہر لفظ میں پوشیدہ ہے خود اپنا جواز
ایماں میں نہ کیوں علم ہو شرطِ اوّل
"اقرأ" ہے نبوّت کا بھی حرفِ آغاز

یقین

دشوار تو ضرور ہے یہ سہل تو نہیں
ہم پر بھی کھل ہی جائیں گے اسرارِ شہرِ علم
ہم ابنِ جہل ہی سہی، بوجہل تو نہیں

زاویۂ نگاہ

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اِسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت نواز دے تو یہی خدا ہے

انکشاف

عالم تھے، باکمال تھے، اہلِ کتاب تھے
آنکھیں کھلیں تو اپنی حقیقت بھی کھل گئی
الفاظ کے لحاف میں ہم محوِ خواب تھے

ارتقاء

یہ اوج اِک فرار ہے آوارہ بادلو
کونپل نے سر اٹھا کے بڑے فخر سے کہا
پاؤں زمیں میں گاڑ کے سوئے فلک چلو

دسترس

کس نے کمند پھینکی ہے رُوح الامین پر
میں سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھا۔ قریب ہی
بادل کا سایہ رینگ رہا تھا زمین پر

مابعد الطبعیات

حرف و رنگ و صوت سب اظہار کے آداب ہیں
ماورائے ذہن ہر تشکیل، ہر کردار میں
آدمی کی آرزو ہے، آدمی کے خواب ہیں

زندگی

دھوپ کے پیچھے سایہ بھاگے، دن کے پیچھے رات
آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں ثابت اور سیّار
سب کی ایک تمنا لیکن کوئی نہ آئے ہاتھ

اِنتباہ

مغرور ہوا سے کہو یہ بات نہ بھولے
جم جائیں تو بن جاتے ہیں اِک کوہِ گراں بھی
ویرانوں میں اُڑتے ہوئے آوارہ بگولے

ارتفاع

اپنی زمیں کا حُسن تھا اپنی نظر سے دُور
دنیا کو ماہتاب سے دیکھا تو یہ کھُلا
ہم ہوں اگر بلند تو یہ خاک بھی ہے نُور

شرط

شب کو سورج کہاں نکلتا ہے
اس جہاں میں تو اپنا سایہ بھی
روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے

جدلیات

مخلوق بھی حیات کا خلّاق بھی ہوں میں
میرے تضاد سے ہے عبارت مرا وجود
گر زہر ہوں تو زہر کا تریاق بھی ہوں میں

تناسخ

اگرچہ قبر میں شب کی، اُتر گیا خورشید
زمیں اُجالے سے پھر بھی نہ ہو سکی محروم
مہ و نجوم کی صورت اُبھر گیا خورشید

دُوسرا رُخ

سورج کا یہ اندازِ گواہی تو نہیں ہے
آئینہ دکھاتا ہے اُجالا مجھے پیہم
سایہ مرے اندر کی سیاہی تو نہیں ہے

خوش فہمی

خوش ہے سورج کہ کٹ گئی ہے رات
کاش یہ بھی اسے خبر ہوتی
سائے سائے میں بٹ گئی ہے رات

بے کسی

کون دُنیا میں رفیقِ غمِ جاں ہوتا ہے
دل میں جاگ اٹھتا ہے جب بھی کوئی سویا ہوا درد
قطرۂ اشک بھی پلکوں پہ گراں ہوتا ہے

دانشور

ہم کہ روشن ظلمتوں میں شمع کی صورت ہوئے
خوش قدوں کے درمیاں پگھلے خود اپنی آگ میں
اور ہم ہی انجمن میں سب سے کم قامت ہوئے

ابن الوقت

سورج تھا سربلند تو محوِ نیاز تھے
سورج ڈھلا تو دل کی سیاہی تھی دیدنی
کوتاہ قامتوں کے بھی سائے دراز تھے

کرسی

جنگل کا خونخوار درندہ کل تھا مرا ہمسایہ
اپنی جان بچانے، میں جنگل سے شہر میں آیا
شہر میں بھی ہے میرے خون کا پیاسا اک چوپایہ

رویتِ ہلال

خود آگہی نہ جدتِ فکر و نظر ملی
وہ قوم آج بھی ہے پرستار چاند کی
جس قوم کو روایتِ شق القمر ملی

کششِ ثقل

آزاد کب ہوا کوئی قیدِ مقام سے
جالندھری ہے کوئی تو کوئی ہے لکھنوی
ترکِ وطن کے بعد بھی نسبت ہے نام سے

نمائش

قرآں، خدا، رسول ہے سب کی زبان پر
ہر لفظ آج یوں ہے معانی سے بے نیاز
لکھتی ہو جیسے نام کی تختی مکان پر

غزل

○

مَیں سوچتا ہوں مگر میری سوچ ہی کیا ہے
بس ایک خوابِ حقیقت ہے، آگہی کیا ہے

ہر ایک بات زباں پر ہے، گفتنی کے سوا
اِس اختیار پہ یہ جبرِ خامشی کیا ہے

وہ روشنی ہے کہ ہر شے نظر سے اوجھل ہے
یہ روشنی ہے تو پھر اور تیرگی کیا ہے

وہ مُشتِ خاک ہَوا نے جسے بکھیر دیا
سمیٹنے کی تگ و دَو ہے آدمی کیا ہے

مَیں آئینے میں بھی ہوں، آئینے کے باہر بھی
مرے وجود کی وحدت میں یہ دُوئی کیا ہے

بدن پہ پیرہنِ خاک کے سوا کیا ہے
مرے الاؤ میں اب راکھ کے سوا کیا ہے

یہ شہر سجدہ گزاراں، دیارِ کم نظراں
یتیم خانۂ ادراک کے سوا کیا ہے

تمام گنبد و مینار و منبر و محراب
فقیہہِ شہر کی املاک کے سوا کیا ہے

کھلے سروں کا مقدر بہ فیضِ جہلِ خرد
فریبِ سایۂ افلاک کے سوا کیا ہے

تمام عمر کا حاصل، بہ فضلِ ربِّ کریم
متاعِ دیدۂ نمناک کے سوا کیا ہے

یہ میرا دعویٰ خود بینی و جہاں بینی
مری جہالتِ سفّاک کے سوا کیا ہے

جہانِ فکر و عمل میں یہ میرا زعمِ وجود
فقط نمائشِ پوشاک کے سوا کیا ہے

حیراں نہ ہو یہ زہر ہے اپنی ہی کشت کا
اک رشتہ سانپ سے بھی ہے باغِ بہشت کا

اچھا کیا کہ تو نے مرا گھر ہی ڈھا دیا
یوں بھی یہ اک فریب ہی تھا سنگ و خشت کا

آرائشیں جُدا سہی، بنیاد ایک ہے
کعبے سے مختلف نہیں پتھر کنشت کا

اس کو رقم کرے گی مرے بعد نسلِ نو
جو باب رہ گیا ہے مری سرنوشت کا

دستک ہوا نے دی ہے ذرا غور سے سنو
طوفاں کی آ رہی ہے صدا غور سے سنو

شاخیں اُٹھا کے ہاتھ دُعا مانگنے لگیں
سرگوشیاں چمن میں ہیں کیا غور سے سنو

محسوس کر رہا ہوں میں کرب شکستگی
تم بھی شگفتِ گُل کی صدا غور سے سنو

گلچیں کو دیکھ لیتی ہے جب کوئی شاخِ گُل
دیتی ہے بد دعا کہ دُعا غور سے سنو

یہ اور بات، خشک ہیں آنکھیں، مگر کہیں
کھُل کر برس رہی ہے گھٹا غور سے سنو

شاخوں سے ٹوٹتے ہوئے پتّوں کو دیکھ کر
روتی ہے مُنہ چھُپا کے ہوا غور سے سنو

یہ دشتِ بے کراں، یہ پُراسرار خامشی
اور دُور اِک صدائے درا، غور سے سنو

یہ بازگشت، میری صدا کی ہے یا مجھے
آواز دے رہا ہے خُدا، غور سے سنو

بڑھتی چلی ہے، ارض و سما میں کشیدگی
کونین میں ہے حشر بپا، غور سے سنو

کب تک زمیں اٹھائے رہے آسماں کا بوجھ
اَب ٹوٹتی ہے رسمِ وفا، غور سے سنو

مَیں ٹوٹتا ہوں، خیر مجھے ٹوٹنا ہی ہے
دھرتی چٹخ رہی ہے ذرا، غور سے سنو

صحرا میں چیختے ہیں بگولے، تو شہر شہر
اِک شور ہے، سکوت فزا، غور سے سنو

شاعر تراشتے تو ہو دل میں خُدا کا بُت
آوازۂ شکستِ اَنا، غور سے سنو

○

مَیں وہ یقیں ہوں، نظر آئے جو گماں کی طرح
تری زمیں پہ ازل سے ہوں آسماں کی طرح

مجھے غروب نہ جانو جو مَیں اُفق پہ نہیں
بکھر گیا ہوں اندھیرے میں کہکشاں کی طرح

وہ نقشِ اَب ہی اچھا جو ہر نظر میں نہیں
اُبھر کے کون مٹے نقشِ رائگاں کی طرح

نظر نظر کا تماشہ بنوں تو کیا حاصل
رہوں تو دل میں رہوں یادِ رفتگاں کی طرح

اُس اَبر کو بھی اُڑا لے گئی یہ تیز ہوا
جو میرے سر پہ رہا دستِ مہرباں کی طرح

مری متاعِ سخن ہے، تمہارا سرمایہ
اِسے سنبھال کے رکھنا متاعِ جاں کی طرح

○

اِس دشت پہ احساں نہ کر اے اَبرِ رواں اور
جب آگ ہو نم خوردہ تو اُٹھتا ہے دُھواں اور

وہ قحطِ جنوں ہے کہ کوئی چاک گریباں
آتا ہے نظر بھی تو گزرتا ہے گماں اور

یہ سنگ زنی میرے لئے بارشِ گُل ہے
تھک جاؤ تو کچھ سنگ بدستِ دگراں اور

سورج کو یہ غم ہے کہ سمندر بھی ہے پایاب
یا رَب مرے قلزم میں کوئی سیلِ رواں اور

شاعر یہ زمیں حضرتِ غالبؔ کی زمیں ہے
ہر شعر طلب کرتا ہے خونِ رگِ جاں اور

○

لُٹا دیا ہے غمِ آب و تاب میں کیا کیا
وگرنہ خواب تھے چشمِ پُر آب میں کیا کیا

بلندیوں کا بھی اُٹھتا ہے پستیوں سے خمیر
زمیں کے راز ہیں اُڑتے سحاب میں کیا کیا

یقیں نہ ہو تو کوئی ڈوب کر ذرا دیکھے
بھنور ہیں سوئے ہوئے نقشِ آب میں کیا کیا

کوئی تو دیکھے مجھے میری آنکھ سے یا رب
دکھائی دیتا ہے مجھ کو سراب میں کیا کیا

بَس لفظ لفظ جو پڑھتا گیا تو بات کُھلی
کِھنچی ہوئی تھیں لکیریں کتاب میں کیا کیا

فقط سکوں کی طلب ہے بنامِ خُلدِ بریں
"فریبِ خود کو دیئے اضطراب میں کیا کیا"

وہ روشنی تھی کہ کچھ بھی نظر میں نہ آسکا
سیاہیاں تھیں رُخِ آفتاب میں کیا کیا

ہجومِ رنگ میں خوشبو کی جستجو کے لئے
دیئے جلائے ہیں طاقِ گلاب میں کیا کیا

ہر ایک نام تھا حرفِ غلط، بجز شاعر
کھلا ہے ذوقِ نظر انتخاب میں کیا کیا

○

وہ ایک لفظ جو شرمندۂ بیاں نہ ہوا
اس ایک لفظ کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا

اس ایک اشک سے قائم ہے آبرو غم کی
جو دل میں ڈوب گیا، آنکھ سے رواں نہ ہوا

○

آنکھ کی قسمت ہے اب بہتا سمندر دیکھنا
اور پھر اک ڈوبتے سورج کا منظر دیکھنا

شام ہو جائے تو دن کا غم منانے کے لئے
ایک شعلہ سا منوّر اپنے اندر دیکھنا

روشنی میں اپنی شخصیّت پہ جب بھی سوچنا
اپنے قد کو اپنے سائے سے بھی کمتر دیکھنا

سنگِ منزل، استعارہ، سنگِ مرقد کا نہ ہو
اپنے زندہ جسم کو پتھر بنا کر دیکھنا

کیسی آہٹ ہے، پسِ دیوار آخر کون ہے
آنکھ بنتا جا رہا ہے، روزنِ در، دیکھنا

ایسا لگتا ہے کہ دیواروں میں در کھل جائیں گے
سایۂ دیوار کے خاموش تیور دیکھنا

اک طرف اُڑتے ابابیل، اک طرف اصحابِ فیل
اب کے اپنے کعبۂ جاں کا مقدر دیکھنا

صفحۂ قرطاس ہے یا زنگ خوردہ آئینہ
لکھ رہے ہیں آج کیا اپنے سخنور دیکھنا

کب تک رہوں میں خوف زدہ اپنے آپ سے
اک دن نکل نہ جاؤں ذرا اپنے آپ سے

جس کی مجھے تلاش تھی، وہ تو مجھی میں تھا
کیوں آج تک میں دُور رہا اپنے آپ سے

دنیا نے تجھ کو میرا مخاطب سمجھ لیا
محوِ سخن تھا میں تو سدا اپنے آپ سے

تجھ سے وفا نہ کی تو کسی سے وفا نہ کی
کس طرح انتقام لیا۔ اپنے آپ سے

لوٹ آ۔ درونِ دل سے پکارے کوئی مجھے
دنیا کی آرزو میں نہ جا اپنے آپ سے

○

رات سنسان، دشت و دَر خاموش
چاند تارے شجَر حجَر خاموش

کوئی آوازِ پا نہ بانگِ جرس
کارواں اور اِس قدر خاموش

ہر طرف اِک مہیب سنّاٹا
دل دھڑکتا تو ہے، مگر خاموش

ہوئے جاتے ہیں کس لئے آخر
ہم سفر، بات بات پر خاموش

ہیں یہ آدابِ رہگذار کہ خوف
راہرَو چُپ ہیں، راہبر خاموش

مختصر ہو نہ ہو شبِ تاریک
ہم کو چلنا ہے تا سحَر خاموش

ڈھل چکی رات، بُجھ گئیں شمعیں
راہ تکتی ہے چشمِ تر خاموش

جانے کب بات کر رہے تھے کہ ہم
ہو گئے ایک نام پر خاموش

ہم سے شاعر بھی ہو گئے آخر
رنگِ حالات دیکھ کر خاموش

○

دشت و فضا میں دُور تک، موجِ سراب دیکھنا
دیدۂ خواب آشنا، حاصلِ خواب دیکھنا

عرصہ گہہِ نمود میں، رزمِ زیان و سود میں
شورشِ موج دیکھنا، رقصِ حباب دیکھنا

خواب و خیال سینۂ شق، نقش و نگار چہرہ فق
فکر و نظر ورق ورق، دِل کی کتاب دیکھنا

ٹوٹا نہیں، بکھر کے بھی خوابِ جنوں ہنوز
سر چڑھ کے بولتی ہے کوئی موجِ خوں ہنوز

بارِ گراں ہے، پھر بھی اٹھائے ہوئے ہیں لوگ
اپنے سروں پہ یہ فلکِ واژگوں ہنوز

دکھلائے پھر کوئی یدِ بیضا کا معجزہ
طاری ہے سامری کا دلوں پر فسوں ہنوز

پھر جوئے شیر کا کوئی دینے لگا فریب
چاہے ہے ضربِ تیشہ کوئی بے ستوں ہنوز

دل بھی ہے رہنِ غیر، بدن بھی ہے رہنِ غیر
اپنی کلاہ کج ہے، بہ حالِ زبوں ہنوز

نعروں میں گونجتا ہوں، تو چپ ہوں کتاب میں
معنی سے بے نیاز، میں اک لفظ ہوں ہنوز

جو شاخ بے ثمر ہے یہاں، سر بلند ہے
اور شاخ باردار کا ہے، سرنگوں ہنوز

سورج پگھل گیا نہ ہو پہلو میں رات کے
اس نم فضا میں آتشِ دل ہے فزوں ہنوز

شاعر میں شعر بھی نہ کہوں اب تو کیا کروں
دل تھا جو بے سکون، سو ہے بے سکوں ہنوز

دیکھے جو آبلے کسی رہرو کے پاؤں میں
نادم کھڑے ہوئے ہیں درخت اپنی چھاؤں میں

اب آدمی سے دور یہاں بھی ہے آدمی
شہروں کی وسعتیں سمٹ آئی ہیں گاؤں میں

بن باس کاٹتے ہیں یہاں وہ برہنہ پا
عظمت ہے تخت و تاج کی جن کے کھڑاؤں میں

○

یہ بات تو نہیں ہے کہ مَیں کم سواد تھا
ٹوٹا ہوں اس بنا پہ کہ مَیں کج نہاد تھا

الزام اپنی موت کا موسم پہ کیوں دھروں
میرے بدن میں میرے لہُو کا فساد تھا

اب میں بھی جل کے راکھ ہُوں میرے جہاز بھی
کل میرا نام طارقِ ابنِ زیاد تھا

ایماں بھی لاج رکھ نہ سکا میرے جھُوٹ کی
اپنے خُدا پہ کتنا مجھے اعتماد تھا

گہرے سمندروں میں بھی پتّھر ملے مجھے
تھا میں گہر شناس، مگر سنگ زاد تھا

تُو بادباں دریدہ سفینے کا ناخُدا
اور قلزمِ سراب کا مَیں سندباد تھا

اب ہوں زباں بُریدہ تو یہ سوچ کر ہوں چُپ
یہ بھی سخن شناس کا اندازِ داد تھا

مشرقی پاکستان کے ٹوٹنے پر۔ سنہ ۱۹۷۲ء

منزل کے خواب دیکھتے ہیں پاؤں کاٹ کے
کیا سادہ دل یہ لوگ ہیں گھر کے نہ گھاٹ کے

اب اپنے آنسوؤں میں ہیں ڈوبے ہوئے تمام
آئے تھے اپنے خون کا دریا جو پاٹ کے

شہرِ وفا میں حقِ نمک یُوں ادا ہُوا
مخمل میں ہیں لگے ہوئے پیوند ٹاٹ کے

کھنچتی تھی جن کے خوف سے سدِّ سکندری
سوئے نہیں ہیں آج وہ دیوار چاٹ کے

اب تو درندگی کی نمائش بھی حُسن ہے
دیوار پر سجاتے ہیں سَر کاٹ کاٹ کے

جب تک زمیں پہ رینگتے سائے رہیں گے ہم
سُورج کا بوجھ سر پہ اٹھائے رہیں گے ہم

کھُل کر برس ہی جائیں کہ ٹھنڈی ہو دِل کی آگ
کب تک خلا میں پاؤں جمائے رہیں گے ہم

جھانکے گا آئینوں سے کوئی اور جب تلک
ہاتھوں میں سنگ و خشت اٹھائے رہیں گے ہم

اِک نقشِ پا کی طرح سہی اِس زمین پر
اپنی بھی ایک راہ بنائے رہیں گے ہم

جب تک نہ شاخ شاخ کے سر پر ہو تاجِ گُل
کانٹوں کا تاج سر پہ سجائے رہیں گے ہم

○

رُکتا ہے اُجالا کہیں ظلمت کی سپر سے
سُورج تو دُر آئے گا ہر اِک روزنِ دَر سے

کملائی ہوئی دُھوپ ہے یا تپتی ہوئی چھاؤں
یہ راز بھی کھُل جائے گا نکلو گے جو گھر سے

اس دَور میں جو شخص ہے دستار بہ سر ہے
ہو کوئی تو، نکلے جو کفن باندھ کے سر سے

جیوں دِل کی سیاہی میں قلم ڈوب گئے ہیں
تحریر کو نسبت نہ رہی خونِ جگر سے

خود اپنے تعاقب میں ہیں پرچھائیں کی مانند
ہم لوگ جو پوشیدہ ہیں خود اپنی نظر سے

کٹتی ہے تو سایوں میں بکھر جاتی ہے ہر رات
شب کا کوئی گہرا ہی تعلق ہے سحر سے

○

اہلِ دل، اہلِ خرد، اہلِ نظر سب سو گئے
سب کو بیداری کا دعویٰ تھا، مگر سب سو گئے

صبح کی خاطر رہے جو رات بھر مشعل بکف
ایسی نیند آئی کہ ہنگامِ سحر، سب سو گئے

اِس کو کیا کہیے کہ احساسِ زیاں کے باوجود
راہ میں کیا راہرو، کیا راہبر سب سو گئے

کارواں خطرے میں ہے، کچھ دیر میں ہی جاگ لوں
کون اِس کا پاسباں ہوگا، اگر سب سو گئے

اِس سفر میں رہزنوں کا خوف پہلے ہی سے تھا
لاکھ چلّاتا رہا شاعرؔ مگر سب سو گئے

آج کی شب جیسے بھی ہو ممکن، جاگتے رہنا
کوئی نہیں ہے، جان کا ضامن، جاگتے رہنا

قزاقوں کے دشت میں جب تک قافلہ ٹھہرے
قافلے والو، رات ہو یا دن، جاگتے رہنا

تاریکی میں لپٹی ہوئی پُر ہول خموشی
اس عالم میں کیا نہیں ممکن، جاگتے رہنا

آہٹ آہٹ پر جانے کیوں دل دھڑکے ہے
کوئی نہیں اطراف میں لیکن، جاگتے رہنا

ٹھنڈی ہواؤں کا اے دل، احساں نہ اٹھانا
کوئی یہاں ہمدرد نہ محسن، جاگتے رہنا

راہنما سب دوست ہیں لیکن اے ہم سفرو
دوست کا کیا ظاہر، کیا باطن، جاگتے رہنا

تاروں کی آنکھیں بھی بوجھل بوجھل سی ہیں
کوئی نہیں اب شاعرؔ تجھ بن جاگتے رہنا

○

ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے، کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

کس لئے کیجے کسی گم گشتہ جنت کی تلاش
جب کہ مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں لوگ

کتنے سادہ دل ہیں اب بھی، سُن کے آوازِ جرس
پیش و پس سے بے خبر، گھر سے نکل جاتے ہیں لوگ

اپنے سائے سائے سر نہوڑائے، آہستہ خرام
جانے کس منزل کی جانب آج کل جاتے ہیں لوگ

شمع کے مانند اہلِ انجمن سے بے نیاز
اکثر اپنی آگ میں چپ چاپ جل جاتے ہیں لوگ

شاعرؔ ان کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھا کر تو سنتے ہیں سنبھل جاتے ہیں لوگ

○

نہ جانے اہلِ نشیمن پہ کیا گھڑی آئی
قفس میں چیخ اُٹھا ہے سکوتِ تنہائی

چمن میں رہ کے مرا حال پوچھنے والو
قفس میں صرف اندھیرا ہے اور تنہائی

نہ جانے بادِ صبا کہہ گئی مذاق میں کیا
کہ ہنستے ہنستے شگوفوں کی آنکھ بھر آئی

قدم قدم پہ کھلے ہیں ہزار لالہ و گل
جو کام آئی تو اپنی ہی آبلہ پائی

کوئی تو بات تھی، ہم کو ملا جو رتبۂ دار
وگرنہ شہر میں کچھ کم نہیں تھے سودائی

راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
میرِ کارواں یارو، میرِ کارواں یارو

اب بتاؤ جائے گی زندگی کہاں یارو
پھر ہیں برق کی نظریں، سوئے آشیاں یارو

اب نہ کوئی منزل ہے اور نہ رہگذر کوئی
جانے قافلہ بھٹکے، اب کہاں کہاں، یارو

پھول ہیں کہ لاشیں ہیں، باغ ہے کہ مقتل ہے
شاخ شاخ ہوتا ہے، دار کا گماں، یارو

موت سے گذر کر یہ کیسی زندگی پائی
فکر پا بہ جولاں ہے، گنگ ہے زباں، یارو

تربتوں کی شمعیں ہیں اور گہری خاموشی
جا رہے تھے کس جانب، آ گئے کہاں، یارو

راہزن کے بارے میں اور کیا کہوں کھل کر
میرِ کارواں یارو، میرِ کارواں یارو

صرف زندہ رہنے کو زندگی نہیں کہتے
کچھ غمِ محبت ہو، کچھ غمِ جہاں یارو

وقت کا تقاضہ تو اور بھی ہے کچھ — لیکن
کچھ نہیں تو سن جاؤ، میرے ہم زباں یارو

ایک میں ہوں جس کو تم مانتے نہیں شاعر
اور ایک میں ہی ہوں، تم میں نکتہ داں یارو

اک سنگدل کا پھر ہے مقدّر بنا ہوا
ہر آدمی ہے شہر میں پتھر بنا ہوا

گوتم سے شرمسار، ارسطو ہے یا نہیں
پورس کی سرزمیں پہ سکندر بنا ہوا

اُس کو ستم نصیب کہوں یا ستم نواز
جو آدمی ہے صبر کا پیکر بنا ہوا

کیا جانے کب نیام سے باہر نکل پڑے
جو ہاتھ آستیں میں ہے خنجر بنا ہوا

تجھ کو نظر نہ آئے تو میری نظر سے دیکھ
آئینے کے اُدھر ہے جو منظر بنا ہوا

بنیاد پر نظر ہو تو شائد سمجھ سکو
کیوں ٹوٹنے لگا ہے مرا گھر بنا ہوا

یہ بات ظرف کی ہے مگر کس سے کیجئے
قطرہ بھی آج کل ہے سمندر بنا ہوا

جو کچھ بھی گزرنا ہے، مرے دل پہ گزر جائے
اُترا ہوا چہرہ مری دھرتی کا نکھر جائے

اک شہرِ صدا سینے میں آباد ہے لیکن
اک عالمِ خاموش ہے جس سمت نظر جائے

ہم بھی ہیں کسی کہف کے اصحاب کی مانند
ایسا نہ ہو، جب آنکھ کھلے، وقت گزر جائے

جب سانپ ہی ڈسوانے کی عادت ہے تو یارو
جو زہر زباں پر ہے وہ دل میں بھی اُتر جائے

کشتی ہے مگر ہم میں کوئی نوح نہیں ہے
آیا ہوا طوفان خدا جانے کدھر جائے

میں سایہ کیے ابر کے مانند چلوں گا
اے دوست جہاں تک بھی تری راہگزر جائے

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ مری بات
خوشبو کی طرح اُڑ کے ترے دل میں اُتر جائے

○

جس کو دیکھ کے شاعر تم للچائے بہت
اس میں بھی تھی روشنی کم اور سائے بہت

آئینے کا سحر ہے یا اندازِ نظر
اپنا عکس ہی اپنے رُوپ دکھائے بہت

کل جو چہرہ نظر نظر کا محور تھا
آج وہ چہرہ دیکھ کے جی بھر آئے بہت

جُوڑے میں جو پھول تھا کل، اب گود میں ہے
دیکھ کے اس کو بیتے دن یاد آئے بہت

مجھ سے تھا پیمانِ وفا سو تم ہے
پھول سے لوگوں نے پتھر برسائے بہت

چہرے کی خاموش لکیریں کہتی ہیں
شرطِ سخن ہے، کہنے کے پیرائے بہت

ہونٹوں پر اک زخمِ تبسم آج بھی ہے
جسموں کی تکفین نے راز چھپائے بہت

بہرے جذبے رُوح کی چیخیں کیا سُنتے
ٹھنڈی پٹڑی ریل تلے چلّائے بہت

حبس سہی کمرے میں رہو تو اچھا ہے
باہر تازہ ہوا تو دھُول اُڑائے بہت

اپنے وطن میں وہ سچا ہے جو یارو
سچائی کو جھوٹے مُنہ بہلائے بہت

شاعر اپنے گھر کا خدا ہی حافظ ہے
اس گھر کو ہیں گھیرے ہُوئے ہمائے بہت

○

گردش میں زندگی ہے بسر کر رہا ہوں میں
سُورج کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہوں میں

یہ آرزو ہے کہ جب بھی گلے لگاؤں اُسے
حصارِ ذات سے باہر نکال لاؤں اُسے

وہ جل رہا تھا کڑی دھوپ کی تمازت میں
ملا جواب تو اُڑھا دوں گا اپنی چھاؤں اُسے

یہ عشق بھی ہے عجب امتحانِ عہد و وفا
وہ آزمائے مجھے اور میں آزماؤں اُسے

وہ شہر، شہرِ چراغاں سہی، مگر اک دن
ہوائیں یاد دلائیں گی اپنا گاؤں اُسے

وہ اپنے خواب میں شائد مجھی کو دیکھتا ہو
میں تشنہ لب سہی، سوتے میں کیا جگاؤں اُسے

میں جو کچھ سوچتا ہوں اب، تمھیں بھی سوچنا ہوگا
جو ہوگا زندگی کا ڈھب، تمھیں بھی سوچنا ہوگا

ابھی تو آنکھ اوجھل ہے مگر خورشید کے ہاتھوں
کھنچے گی جب ردائے شب، تمھیں بھی سوچنا ہوگا

مقدر میں تمھارے کیوں نہیں لکھّا، بجز میرے
صلیب و دار کا منصب، تمھیں بھی سوچنا ہوگا

یہ کیسا قافلہ ہے جس میں سارے لوگ تنہا ہیں
یہ کس برزخ میں ہیں ہم سب، تمھیں بھی سوچنا ہوگا

خدا اور آدمی دونوں اگر عینِ حقیقت ہیں
حقیقت میں ہے کیا مذہب، تمھیں بھی سوچنا ہوگا

اِس دشتِ سخن میں کوئی کیا پھول کھلائے
چمکی جو ذرا دھوپ تو جلنے لگے سائے

سورج کے اُجالے میں چراغاں نہیں ممکن
سورج کو بجھا دو کہ زمیں جشن منائے

مہتاب کا پرتو بھی ستاروں پہ گراں ہے
بیٹھے ہیں شبِ تار سے اُمید لگائے

ہر موجِ ہوا شمع کے درپے ہے ازل سے
دِل سے کہو، لَو اپنی ذرا اور بڑھائے

کس کوچۂ طفلاں میں چلے آئے ہو شاعر
آوازہ کسے ہے تو کوئی سنگ اٹھائے

نظم

آئینہ در آئینہ

اِس بار وہ ملا تو عجب اُس کا رنگ تھا
الفاظ میں ترنگ نہ لہجہ دبنگ تھا
اِک سوچ تھی کہ بکھری ہوئی خال و خط میں تھی
اِک درد تھا کہ جس کا شہید انگ انگ تھا
اِک آگ تھی کہ راکھ میں پوشیدہ تھی کہیں
اِک جسم تھا کہ روح سے مصروفِ جنگ تھا
میں نے کہا کہ یار تمھیں کیا ہوا ہے یہ
اُس نے کہا کہ عمرِ رواں کی عطا ہے یہ
میں نے کہا کہ عمرِ رواں تو سبھی کی ہے
اُس نے کہا کہ فکر و نظر کی سزا ہے یہ
میں نے کہا کہ سوچتا رہتا تو میں بھی ہوں
اُس نے کہا کہ آئینہ رکھا ہوا ہے یہ
دیکھا تو میرا اپنا ہی عکسِ جلی تھا وہ
وہ شخص میں تھا اور حمایت علی تھا وہ

پا بہ گل

صدیوں کا فاصلہ ہے جنگل سے میرے گھر تک
شاخِ ثمر بکف سے تخلیق کے ہُنر تک
اُس پا پیادگی سے اِس برق پا سفر تک

یہ فاصلہ ہے میرے ذہنِ رسا کا ضامن
منزل سے تا بہ منزل ہر نقش پا کا ضامن
ہر خواب، ہر حقیقت، ہر ارتقاء کا ضامن

اب میری دسترس میں، سورج بھی ہے ہوا بھی
یہ پُر کشش زمیں بھی، وہ بے کشش خلا بھی
اب تو ہے میری زد میں دنیائے ماورا بھی

پھر بھی نہ جانے کیوں میں جنگل کو اتنا چاہوں
فردوسِ گم شدہ کے موہوم خواب دیکھوں
آنگن میں کچھ نہیں تو اک پیڑ ہی لگاؤں

سمندر اور انسان

قلزم بیکراں! تیرا پھیلاؤ
زندگی کے شعور کا غماز
تیری موجوں کا پُرسکون بہاؤ
زندگی کے سرور کا غماز
تیرے طوفان کا اُتار، چڑھاؤ
زندگی کے غرور کا غماز

سوچتا ہوں کہ تیری فطرت سے
میری فطرت ہے کتنی ہم آہنگ
تیری دنیا ہے کیسی بے پایاں
میری دنیا ہے کیسی رنگا رنگ
تو ہے کتنا وسیع اور محدود
میں ہوں کتنا وسیع، کتنا تنگ

میرے ماتھے پہ کتبۂ تقدیر
تیری موجیں ترے لئے زنجیر

جواب

سورج نے جاتے جاتے بڑی تمکنت کے ساتھ
ظلمت میں ڈوبتی ہوئی دنیا پہ کی نظر
کہنے لگا کہ کون ہے اب اس کا پاسباں
میرے سوا ہے کون زمانے کا راہبر
میں تھا تو اپنی راہ پہ تھی گامزن حیات
اب میں نہیں رہوں گا تو یہ ساری کائنات
ظلمات میں بھٹکتی پھرے گی تمام رات

سورج یہ کہہ کے جا ہی رہا تھا کہ اِک دیا
چپکے سے جل اٹھا اور اُسے دیکھنے لگا

اندیشہ

سہمی سہمی کھِل رہی تھی اِک کلی
مَیں نے پوچھا
کیا خزاں کا خوف ہے؟
جی نہیں — اِک دن خزاں تو آئے گی
پھر؟
سُنا ہے . . . . (اس نے چپکے سے کہا)
اس چمن کا باغباں مچھیں بھی ہے

بگولا

مَیں سوچتا ہوں
مَیں ایک انساں ہوں، ایک مشتِ غبار ہوں میں . . .
ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا
کہ ایک آواز سرسرائی فضا کی خاموش وسعتوں میں
مَیں چونک اٹھا
پلٹ کے دیکھا
کوئی ہوائی جہاز پرواز کر رہا تھا
جو لمحہ لمحہ بلندیوں کی طرف رواں تھا
مَیں اس کو تکتا رہا مسلسل
نہ جانے کب تک —

نہ جانے اس لمحۂ گریزاں کے تنگ دامن میں
کتنی صدیاں سمٹ گئی تھیں
نہ جانے میری نظر میں کتنے نئے اُفق جگمگائے
کتنے ہی چاند سورج اُبھر کے ڈوبے
نہ جانے وہ کون سا جہاں تھا

زمیں — کہ پیروں تلے کوئی فرشِ زر ہو جیسے
فلک — کہ سر پہ ردائے آبِ گہر ہو جیسے
فضا — منوّر
ہوا — معطّر
نفس نفس میں بسی ہوئی نکہتِ گُلِ تر
خلاؤں میں مشتری و زہرہ کا رقص جاری
تمام عالم پہ ہلکا ہلکا سرور طاری

نہ جانے میں کس خیال میں گم
کِس ابر پارے پہ اُڑ رہا تھا
غرور سے سر بلند کر کے ہر اک ستارے کو دیکھتا تھا
کہ ایک دِلدوز چیخ گونجی فضا کی خاموش وسعتوں میں
مَیں چونک اٹھّا
پلٹ کے دیکھا
گلی سے اِک ہڈّیوں کا ڈھانچہ گزر رہا تھا
جو چیخ کر ایک اک سے کہتا تھا
ایک روٹی — خُدا تمہارا بھلا کرے گا"

ایک منظر

کہکشاں کی جگمگاتی فصل لہرائی ہوئی
دُور — اُفق کی اوٹ سے محوِ نظارہ ماہتاب
شب کسی اندیشۂ فردا سے کجلائی ہوئی

سوچتا تھا، یہ چمکتی فصل جب کٹ جائے گی
دامنِ مہتاب میں کھل جائیں گے چاندی کے پھول
رات کے ماتھے سے گردِ تیرگی چھٹ جائے گی

سوچتا تھا مَیں کہ دیکھا، رات ساری کٹ گئی
ایک سورج ناگہاں اُبھرا بصد جاہ و جلال
چاند کی دولت، سحر کے غاصبوں میں بٹ گئی
سورج اپنی کامرانی پر بہت مسرور ہے
سوچتا ہوں، اس سحر سے شام کتنی دُور ہے

۱۹۵۹ء: پہلا مارشل لا

آگ میں پھول

— جیسے آغوشِ محبت میں ہمکتی ہوئی ننھی بچی
اپنے بابا کو کسی فکر میں ڈوبا ہوا پاکر — خود بھی
کھیلتے کھیلتے چپ چاپ کسی سوچ میں کھو کر رہ جائے
اور پھر باپ کی پلکوں پہ لرزتا ہوا کوئی آنسو
اپنی بچی کے کھلے پھول سے رخسار پہ گر کر بہہ جائے

گوسالہ

لوحِ کلیم ٹوٹ گئی — پارہ پارہ ہے
ہارون شرمسار کہ موسیٰ سے کیا کہے
گوسالے کو جب امّتِ موسیٰ خدا کہے

گوسالہ — زر پرستی کا جو استعارہ ہے

لفظوں کے در کھلے تو معانی ہوئے عیاں
جاری ہے ہر خیال میں آزر کا سلسلہ
ٹوٹا نہیں حرم میں بھی پتھر کا سلسلہ
اک کارگاہِ سنگ ہے، شیشے کی ہر دکاں

گوسالہ اب بھی زندہ ہے دولت کے روپ میں
بدلے نہیں ہیں آج بھی آدابِ بندگی
اک سامری کا خواب ہے، ہر خوابِ بندگی
یہ رات، سایہ سایہ ہے سُورج کی دھوپ میں

لمحۂ فکر

تم بھی فریب خوردہ ہو ہم بھی تھے بے خبر
دونوں ہی باشعور نہ تھے قصہ مختصر
تاریخ ہر قدم پہ دکھاتی تھی آئینہ
تاریخ کا مذاق اُڑاتے تھے دیدہ ور
اب زخمِ سر کھُلا تو ملا سنگ کا سراغ
پتھر سے بے نیاز تھا ہر ایک شیشہ گر

پتھر — کہ حرف و صوت بھی نقش و نگار بھی
پتھر — کہ رنگِ رُخ بھی، لہو کا خمار بھی
پتھر — بلند و پست کا خود ساختہ نظام
پتھر — زمیں کا غم بھی، فلک کا وقار بھی
پتھر — خدا کے نام پہ تکبیرِ ناخُدا
پتھر ہی سنگِ میل بھی، سنگِ مزار بھی

ہر اک قدم پہ سنگ کو نسبت تھی سر کے ساتھ
اور سائے کی تلاش میں ہم تھے شجر کے ساتھ

سوچا نہ تھا کہ سایہ ہے سورج کا ہم سفر
سورج مگر نہیں ہے کسی ہم سفر کے ساتھ
خوابوں کی دھوپ چھاؤں میں افلاک کے تلے
تھا رقصِ گردِ باد، نہایت ہُنر کے ساتھ

یہ آگہی کا نُور کہ خیرہ ہے چشمِ دل
احساسِ تیرگی کہ ہے تابندگی خجل
دِل ہے لہو لہو تو جگر داغ داغ ہے
افکار گرد گرد ہیں، جذبات مشتعل
گردوں دھواں دھواں ہے فضا ہے شرر شرر
سر ہیں ہوا کے دوش پر اور رُوح پا بہ گِل

اس معرضِ فنا میں ذرا کل کی سوچیے
جینے کی آرزو میں نہ مقتل کی سوچیے
موسم کا پیرہن تو نظر کا فریب تھا
راز کی فکر کیجیے، موسم کی سوچیے
مآئیر، ماروی کا رہے گا سدا — مگر
صدیوں کے ارتباط میں اِس پل کی سوچیے

پسِ دیوارِ حرف

(لسانی فسادات ۱۹۷۲ء)

کس کو قاتل کہوں، کس کو بسمل کہوں
یہ مرا دوست ہے، وہ مرا بھائی ہے
اپنی تاریخ سے گر اِسے پیار ہے
اپنی تہذیب کا وہ بھی شیدائی ہے
بے زبانی کا ہے یہ بھی مارا ہُوا
وہ بھی اپنی زباں کا تمنائی ہے

میں کہ دونوں ہی میرے لیے جان و دل
میری نظروں میں دونوں ہی معصوم ہیں
وقت کا جبر کہیے کہ تاریخ کا
وہ بھی مظلوم تھے، یہ بھی مظلوم ہیں
وہ کہ اُن کے سروں پہ ہے مٹی کا قرض
یہ زمیں کی رفاقت سے محروم ہیں

آسماں لاکھ سر پر ہو سایہ فگن
زندگی ماسوائے زمیں کچھ نہیں

گر یقیں ہو تو ہر اک تصور حسیں
اور گماں ہو تو دُنیا و دیں کچھ نہیں

جس کا ماضی نہ ہو، اس کا فردا ہی کیا
دُور تک اِک خلا ہے، کہیں کچھ نہیں

ایسے عالم میں درکِ حقیقت ہو کیا
فکر گنجلک، نظر تنگ، دل بدگماں

حرفِ حق، ایک پیرایۂ مکر و فن
مصلحت، معنی و لفظ کے درمیاں

عکس در عکس افسونِ آئینہ ساز
شکل در شکل بہروپیے مہرباں

کون جانے پسِ آئینہ کون تھا
کون سوچے کہ پیشِ نظر کون ہے

رُوپ بہروپ میں ربط پنہاں ہے کیا
دستِ پُرکار سے باخبر کون ہے

شیشہ و سنگ میں عہد و پیماں ہیں کیا
سنگ زن کون ہے شیشہ گر کون ہے

سوچتا ہوں تو چپ چاپ روتا ہوں میں
خود فریبی نے پہنچا دیا ہے کہاں

کعبۂ فکر میں صرف لفظوں کے بُت
آنکھ اوجھل، معانی کی پنہائیاں

گرد کی طرح بکھرا ہُوا فرد فرد
بادلوں کی طرح بے جہت کارواں

خواب میں طے ہُوا زندگی کا سفر
خواب ہی میں جلے منزلوں کے چراغ

خواب ہی میں ہُوا وہم تعبیرِ خواب
خواب ہی میں فروزاں ہوئے دل کے داغ

خواب در خواب، بے خوابیِ چشم وا
خواب ٹوٹے تو ہاتھ آئے اپنا سُراغ

آج وا ہو گئے زخمِ لب تو کھلا
سینہ در سینہ ہر زخم ناسُور تھا

بادۂ ناب کا تو فقط نام تھا
ہر بدن نشۂ زہر سے چُور تھا
قرب کے ہر تصوّر میں تھے فاصلے
آدمی آدمی سے بہت دُور تھا

اَب کہ دامانِ یوسف کے ہر چاک سے
آئینہ ہو گیا ہر فریبِ کہن
ضربتِ تیشہ کی زد پہ ہے بے ستوں
رُو برُو آ گئے خسرَو و کوہکن
بوذری اپنی منزل ہے یا زرگری
فیصلہ چاہتی ہے زمینِ وطن

مؤمنین جوڈرو میں دُوسرا آدمی

بدل گئے ہیں عقیدے، بدل گئی تہذیب
مگر وہ خون کہ آتی ہے جس سے بُوئے حبیب
بدن کا دوست ہے لیکن دماغ و دل کا رقیب

لہو کا رشتہ، ازل اور ابد کا رشتہ ہے
بصد تضاد سہی، خال و خد کا رشتہ ہے
یہ آدمی کی دوئی میں احد کا رشتہ ہے

میں سوچتا ہوں کہ میرے ہزار نام سہی
میں زندگی کی مسافت میں بے مقام سہی
یہ میرے حال سے ماضی کا انتقام سہی

میں آج اپنے کھنڈر میں ہوں اپنے گھر کی طرح
یہ میرے ساتھ رہا، میرے بام و در کی طرح
یہ شہر مجھ میں ہے زندہ، مرے ہنر کی طرح

میں اجنبی نہیں روحِ وطن، مجھے پہچان
میں تیرا خون ہوں تیرا بدن، مجھے پہچان
نہاں ہے مجھ میں ترا بانکپن، مجھے پہچان

مریم سے ایک سوال

مریم۔ تمھیں تو خون تھا اپنا بہت عزیز
تم نے تو اس کے واسطے سب سے لڑائی کی

تاریخ ہے گواہ کہ اپنی انا کے ساتھ
(لے کر خدا کا نام) تمھیں نے خدائی کی

تم نے حسب نسب کی روایت کو توڑ کر
رکھی بِنا جہان میں آزاد اکائی کی

جس خوں سے سرخرو ہوئی مجروح مامت
اُس خوں نے آدمی کی بہت رہنمائی کی

جو ہاتھ پھول بن گیا شاخِ صلیب پر
اس نے رخِ حیات کی پردہ کشائی کی

○

مریم۔ یہ خون بھی تو تمہارا ہی خون ہے
کیوں تم نے اپنے خون سے بے اعتنائی کی

اس خون میں مہک ہے تمہارے ہی دودھ کی
کیوں مامتا پہ شرط ہے اب کتخدائی کی

تم تو زمیں ہو، مرکزِ تخلیقِ زندگی
کیوں آج تم کو فکر ہوئی پارسائی کی

تم نے تو آدمی کو کیا تھا خدا صفات
تکذیب کی ہے کس لئے اپنی بڑائی کی

کیوں آج شرطِ رزق ہے یہ شجرۂ نسب
تم نے تو اپنے آپ سے بھی بے وفائی کی

مریم: کہو کہ جائے یہ لختِ جگر کہاں
اللہ کی زمین پہ ہے اس کا گھر کہاں

پرانے سلسلے
نئے رابطے

عمر ہو، جام تماچی ہو، یا چنیسر ہو
تمہارا کوئی بھی ہو نام، کوئی مذہب ہو
تمہاری خاک سے میں ہوں، مرے لہو میں ہو تم
مرے خدا کی زمیں کا وقار، تم سب ہو

وہ ماروی ہو کہ نوری، سسی ہو یا لیلاں
ہر ایک پیار بھرا دل، مری زمیں کا جمال
ملیر تا بہ موئن جو دڑو، مری تاریخ
ہر اک فسانہ، مری داستانِ ہجر و وصال

میں اپنی چاہ میں رانو، وفا میں رائے ڈیاچ
مرا سکون ہے سورٹھ، مرا جنوں بیجل
مرے وجود میں شہباز، روح میں سرمد
مرا دماغ لطیفی تو میرا دل سچل

مرا بدن مری دھرتی ہے جس کے دامن میں
بچھے ہوئے ہیں یہ دریا، مری رگوں کی طرح
یہ ریگزار ہے میرا ہی ریزہ ریزہ جسد
مرے درخت ہیں سب، میرے بازوؤں کی طرح

میں ابر بن کے اڑا تو مرے سمندر نے
مری ہواؤں کا جھولا بنا دیا مجھ کو
کیا گریز زمیں سے تو بے زمینی نے
وہ گردشیں دیں، بگولا بنا دیا مجھ کو

میں گرد گرد کہیں تھا تو آب آب کہیں
سمیٹتا رہا پھر بھی زمیں کا چاک مجھے

دِکھا کے مجھ کو مرا ظرف۔ کوزہ گر کی طرح
مرے حدود میں لے آئی میری خاک مجھے

مرا سفر مری تاریخ کا ہے آئینہ
وہ آئینہ جو شکستہ بھی ہے، سلامت بھی
کسی کو اس میں نظر آئے کیا مرا پرتو
کہ میں بھی جس میں ہوں کچھ اور، میری صورت بھی

یہ چہرہ جس کا ابھی کوئی نام ہے نہ نسب
یہ چہرہ میرا ہے، لیکن ہے یہ تمہارا بھی
وہ رابطہ کہ جو تاریخ میں ہے دفن کہیں
ہماری ہم نسبی کا ہے استعارہ بھی

تمہارے ورثۂ اجداد کو خدا رکھے
مجھے بھی پیار مرے شہرِ ست دبود سے ہے
مری زمیں ہے مری ماں، میں ابنِ مریم ہوں
تمہارا خوں سے ہے رشتہ تو میرا دودھ سے ہے

ہارون کی آواز

دیکھو۔ ابھی ہے وادیِ کنعاں نگاہ میں
تازہ ہر ایک نقشِ کفِ پا ہے راہ میں
یعقوب بے بصر سہی، یوسف کی چاہ میں
لہرا رہا ہے آج بھی طرّہ کلاہ میں

یہ طرّہ گر گیا تو اُلٹ جائے گی زمیں
محور سے اپنے اور بھی ہٹ جائے گی زمیں

تاریخ کے سفر میں غلط بھی قدم اُٹھے
گاہے لباسِ فقر میں اہلِ حشم اُٹھے
گاہے صنم تراش بہ نامِ حرم اُٹھے
پردے نگاہ کے بھی مگر بیش و کم اُٹھے

یوں بھی ہُوا، دہائی اکائی میں ڈھل گئی
خورشید کے الاؤ میں ہر شئے پگھل گئی

جب یوں نہ ہو سکا تو یہ تاریخ ہے گواہ
اُٹھے عصا بدست، غلامانِ کج کلاہ
زیرِ زمیں کشادہ ہوئی زندگی کی راہ
اور کچھ نہ کر سکی، کسی فرعون کی سپاہ

ہر موجِ نیل، سانپ سی بل کھا کے رہ گئی
اہرام کی نگاہ بھی پتھرا کے رہ گئی

اضداد کی یہ جنگ، اصولِ قدیم ہے
اور اب کہ آدمی کی اکائی دو نیم ہے
افلاک کے تلے سہی، مٹی عظیم ہے
ہارون کی زبان بھی، لوحِ کلیم ہے

حد سے گزر نہ جائیں کہیں کمترین لوگ
موسیٰ کے انتظار میں ہیں بے زمین لوگ

یوسف ثانی

میں چاہِ کنعاں میں زخم خوردہ پڑا ہوا ہوں
زمیں میں زندہ گڑا ہوا ہوں
کوئی مجھے اس برادرانہ فریب کی قبر سے نکالے
مجھے خریدے کہ بیچ ڈالے
کہ چشمِ یعقوب تو مرے غم میں کل بھی گریاں تھی۔
آج بھی ہے

مادرِ وطن کا نوحہ

میرے بدن پر بیٹھے ہوئے گِدھ
میرے گوشت کی بوٹی بوٹی نوچ رہے ہیں
میری آنکھیں ـــ میرے حسیں خوابوں کے نشیمن
میری زباں ـــ موتی جیسے الفاظ کا درپن
میرے بازو ـــ خوابوں کی تعبیر کے ضامن
میرا دل ـــ جس میں ہر ناممکن بھی ممکن
میری روح، یہ سارا منظر دیکھ رہی ہے
سوچ رہی ہے
کیا یہ سارا کھیل تماشہ
(خونخواروں کے دسترخوان پہ میرا لاشہ)
لذتِ کام و دہن کے لئے تھا؟

۱۹۵۸ء

کاش !

یہ سب اشجار کتنے خوبصورت ہیں
نظر آتا ہے
سب کڑیل جواں، دھرتی کے بیٹے
موسموں کا ظلم سہتے
سر اُٹھائے اپنے پیروں پر کھڑے ہیں
اپنی ماں کو اپنے سائے میں لیئے
سینہ سپر ہیں
کاش میں بھی اک شجر ہوتا

پُرتو

جب بھی دیکھا ہے اسے دِل نے یہ محسوس کیا
جیسے میرے سحر و شام کا محور ہے یہی
میری تخئیل کے آذر نے تراشا ہے جسے
میرے خوابوں کا وہ بے نام سا پیکر ہے یہی

کوئی خلوت ہو کہ جلوت، وہ کسی بزم میں ہو
مجھ کو ہر رنگ میں دلدار نظر آیا ہے
کوئی عالم ہو، کوئی حال ہو میرا لیکن
وہ مجھے میرا طلب گار نظر آیا ہے

اس کی آنکھوں کی وہ معصوم سی دُزدیدہ چمک
کتنے ناگفتہ فسانوں کی ہے تمہید نہ پوچھ
اس کے گل رنگ لبوں کا وہ تبسم وہ حجاب
کس تمنا کی ہے بے ساختہ تائید نہ پوچھ

اس کے اندازِ تکلم کی وہ ممتاط روش
کس نوازش کی ہے غماز، کوئی کیا جانے
پاس رہ کر بھی، وہ کچھ دُور ہی رہنے کی ادا
کس رفاقت کا ہے آغاز، کوئی کیا جانے

اتنا مانوس ہے اس کا ہر اک انداز کہ دِل
اس کی ہر بات کا افسانہ بنا لیتا ہے
اس کے ترشے ہوئے پیکر سے چُرا کر کچھ رنگ
اپنے خوابوں کا صنم خانہ سجا لیتا ہے

جانے اِس حُسنِ تصوّر کی حقیقت کیا ہے
جانے ان خوابوں کی قسمت میں سحر ہے کہ نہیں
جانے وہ کون ہے، مَیں نے اسے سمجھا کیا ہے
جانے اس کو بھی مرے دل کی خبر ہے کہ نہیں

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ حُسنِ دلدار
میری تخئیل کے پُرتو کے سوا کچھ بھی نہ ہو
اضطراب اور سکوں کی یہ کشاکش یہ ستیز
خود فریبی کی تگ و دو کے سوا کچھ بھی نہ ہو

اَن کہی

تجھ کو معلوم نہیں، تجھ کو بھلا کیا معلوم . . .

تیرے چہرے کے یہ سادہ سے اچھوتے سے نقوش
میری تخئیل کو کیا رنگ عطا کرتے ہیں
تیری زلفیں، تری آنکھیں، ترے عارض، ترے ہونٹ
کیسی اَن جانی سی، معصوم خطا کرتے ہیں

تیرے قامت کا لچکتا ہُوا مغرور تناؤ
جیسے پھولوں سے لدی شاخ ہَوا میں لہرائے
وہ چھلکتے ہوئے ساغر سی جوانی، وہ بدن
جیسے شعلہ سا نگاہوں میں لپک کر رہ جائے

خلوتِ بزم ہو یا جلوتِ تنہائی ہو
تیرا پیکر مری نظروں میں اُبھر آتا ہے
کوئی ساعت ہو، کوئی فکر ہو، کوئی ماحول
مجھ کو ہر سمت، ترا حُسن نظر آتا ہے

چلتے چلتے جو قدم آپ ٹھٹک جاتے ہیں
سوچتا ہوں کہ کہیں تُو نے پکارا تو نہیں
گم سی ہو جاتی ہیں نظریں تو خیال آتا ہے
اس میں پنہاں تری آنکھوں کا اشارہ تو نہیں

دھوپ میں سایہ بھی ہوتا ہے گریزاں جس دم
تیری زلفیں مرے شانوں پہ بکھر جاتی ہیں
تھک کے جب سر کسی پتھر پہ ٹکا دیتا ہوں
تیری باہیں مری گردن میں اتر آتی ہیں

آنکھ لگتی ہے تو دل کو یہ گماں ہوتا ہے
سرِ بالیں کوئی بیٹھا ہے بڑے پیار کے ساتھ
میرے بکھرے ہوئے اُلجھے ہوئے بالوں میں کوئی
انگلیاں پھیرتا جاتا ہے بڑے پیار کے ساتھ

جانے کیوں تجھ سے دلِ زار کو اتنی ہے لگن
کیسی کیسی نہ تمناؤں کی تمہید ہے تُو
دن میں تو اک شبِ مہتاب ہے میری خاطر
سرد راتوں میں مرے واسطے خورشید ہے تُو

اپنی دیوانگیٔ شوق پہ ہنستا بھی ہوں میں
اور پھر اپنے خیالات میں کھو جاتا ہوں
تجھ کو اپنانے کی ہمت ہے نہ کھو دینے کا ظرف
کبھی ہنستے کبھی روتے ہوئے سو جاتا ہوں

کس کو معلوم مرے خوابوں کی تعبیر ہے کیا
کون جانے کہ مرے غم کی حقیقت کیا ہے
میں سمجھ بھی لوں اگر اس کو محبت کا جنوں
تجھ کو اس عشقِ جنوں خیز سے نسبت کیا ہے

تجھ کو معلوم نہیں، تجھ کو نہ ہوگا معلوم

تیرے چہرے کے یہ سادہ سے اچھوتے سے نقوش
میری تخئیل کو کیا رنگ عطا کرتے ہیں
تیری زلفیں، تیری آنکھیں، ترے عارض، ترے ہونٹ
کیسی اَن جانی سی، معصوم خطا کرتے ہیں

غمِ حاصل

اس کو پا کر بھی دل افسردہ رہا کرتا ہے
اس کو پا کر بھی کسی شئے کی کمی ہے شاید
چشمِ خنداں کی چمک دیکھ کے آتا ہے خیال
یہ تبسم نہیں، اشکوں کی نمی ہے شاید
جسم اک برق کا پیکر ہے، نظر کو تسلیم
دل کو ہر دم یہ گماں، برف جمی ہے شاید

عشق تو خیر ہے اک جذبۂ سوزاں کہ جسے
کسی سائے کسی ٹھنڈک کی ضرورت ہی نہیں
کوئی آندھی، کوئی طوفاں ہو بہ فیضِ غمِ دل
اِس دیئے کو کسی فانوس کی حاجت ہی نہیں
عجز اتنا کہ اک آنسو میں سمٹ کر رہ جائے
اور پندار کہ احساسِ ہزیمت ہی نہیں

پھر یہ اک خار سا جو دل میں کھٹکتا ہے مدام
آخر اس کربِ مسلسل کی حقیقت کیا ہے
نوجوانی تو ہے خود اپنی جگہ حُسن تمام
اس کو آرائشِ قامت کی ضرورت کیا ہے
دل کی دھڑکن کا تقاضہ تھا کہ دو دل مل جائیں
پھر یہ خاموش سا احساسِ ہزیمت کیا ہے

سوچتا ہوں تو غمِ دل پہ ہنسی آتی ہے
کتنے نادان ہیں ہم عشق کے مارے ہوئے لوگ
زندگی کیا ہے حقیقت میں سمجھتے ہی نہیں
اپنے ماحول کی قبروں میں اُتارے ہوئے لوگ
ایک موہوم تصوّر ہے کہ جس کے اطراف
گھومتے رہتے ہیں ہم زیست سے ہارے ہوئے لوگ

وہ حسیں روپ کہ جس کے لئے دل نے اب تک
کسی کعبے، کسی بُت خانے میں سجدہ نہ کیا
ہر شبِ ہجر گذاری ہے بہ اندازِ وصال
کسی غم کو کبھی خلوت میں بھی رسوا نہ کیا
ہر نفس ایک جہنّم کی تپش سے گذرا
اور اشکوں سے بھی اِس آگ کو ٹھنڈا نہ کیا

وہ حسیں روپ بھی آخر ہے اک انساں پیکر
اور وہ پیکر کسی پتّھر کا تراشیدہ نہیں
کوئی انسان ہو، دل ہے تو یہ دنیا بھی ہے
اور اس شیشے سے نازک تو کوئی شیشہ نہیں
آدمی کیا ہے اگر حسِّ لطافت مٹ جائے
زندگی کیا ہے گر آسائشِ یک لمحہ نہیں

آج جب عشق غمِ زیست سے ٹکرایا ہے
ٹوٹ کر رہ گیا خوابوں کا ہر اک تاج محل
کسی تخیّل کو اب دعوئ فردوس نہیں
دل ہے اب اپنی تمنّاؤں کا خود اک مقتل
کوئی ساعت ہو کوئی راہگذر ہو ہر گام
زیست کی تاک میں بیٹھی نظر آتی ہے اجل

چل خسرو گھر اپنے

تھک چکے پاؤں بس اب اے دلِ ناداں، چل بھی
چل کہ اب رات کا نشہ بھی ہے مائل بہ خمار
قمقمے اونگھ رہے ہیں کہ بہت جاگ چکے
کچھ ستارے ہیں تو اُن کی بھی ہیں پلکیں بوجھل
وہ بھی تیرے لئے نیند اپنی بہت تیاگ چکے

چاند، پہرے کے سپاہی کی طرح استادہ
سوچ میں ہے کہ جو تو، جائے تو وہ بھی چل دے
رہگذر، ایک طوائف کی طرح واماندہ
ایسے لیٹی ہے کہ کون آئے گا اب رات گئے

ایک اک ذرّے کی آنکھوں میں ہے نیند آئی ہوئی
تُو بھی گھر چل کے ذرا دیر مرے دل، سو لے
کوئی ایسا نہیں اِس وقت جو تیری خاطر
چند لمحوں کے لئے ہی سہی، آنکھیں کھولے

اِتنا خاموش ہے ماحول کہ چلتے ہوئے اب
اپنی آواز کفِ پا بھی گذرتی ہے گراں
تیری دھڑکن مری سانسوں کی ضمانت ہی سہی
تیری چُپ چاپ سی دھڑکن بھی ہے وحشت ساماں

کب تک اس قبر کی وادی میں پھرے گا پاگل
یوں کبھی مِل بھی سکی ہے غمِ دوراں سے نجات
چل کہ جن چہروں سے بڑھ جاتی ہے تیری وحشت
وہی چہرے ہیں مرے دل، ترا عنوانِ حیات
اور تجھے جینا ہے اے کُشتۂ دوراں کل بھی

مدت کے بعد

مدّت کے بعد تم سے مِلا ہوں تو یہ کھُلا
یہ وقت اور فاصلہ، دھوکہ نظر کا تھا
چہرے پہ عمر بھر کی مسافت رقم سہی
دِل کے لئے تمام سفر، لمحہ بھر کا تھا

کیسی عجیب ساعتِ دیدار ہے کہ ہم
پھر یوں مِلے کہ جیسے کبھی دور ہی نہ تھے
آنکھوں میں کم سنی کے وہ سب خواب جاگ اُٹھے
جن میں نگاہ و دِل کبھی مجبور ہی نہ تھے

معصوم کس قدر تھیں وہ بے نام چاہتیں
بچپن سے ہم کنار تھا عہدِ شباب بھی
یوں آتشِ بدن میں تھی شبنم گھُلی ہوئی
مہتاب سے زیادہ نہ تھا آفتاب بھی

پھر وہ ہَوا چلی کہ سبھی کچھ بِکھر گیا
وہ محفلیں، وہ دوست، وہ گلرنگ قہقہے
اب رقصِ گرد باد کی صورت ہے زندگی
یہ وقت کا عذاب کہاں تک کوئی سہے

اب تم مِلیں تو کتنے ہی غم ہیں تمہارے ساتھ
پتھر کی طرح تم نے گذاری ہے زندگی
کتنا لہو جلایا تو یہ پھول مُسکرائے
کس کس جتن سے تم نے سنواری ہے زندگی

میں نے بھی ایک جہدِ مسلسل میں کاٹ دی
وہ عمر — تھی جو پھول سے ارماں لئے ہوئے

اب وہ جنوں رہا ہے نہ وہ موسمِ بہار
بیٹھا ہوں اپنا چاک گریباں سیے ہوئے

اب اپنے اپنے خوں کی امانت ہے اور ہم
اور ان امانتوں کی حفاظت کے خواب ہیں
آنکھوں میں کوئی پیاس ہو، دِل میں کوئی تڑپ
پھیلے ہوئے افق سے افق تک سراب ہیں

کس کو خبر تھی لمحہ اک ایسا بھی آئے گا
ماضی تمام پھر سمٹ آئے گا، حال میں
محسوس ہو رہا ہے کہ گذرا نہیں ہے وقت
اک لمحہ بٹ گیا تھا فقط ماہ و سال میں

تم بھی وہی ہو، میں بھی وہی، وقت بھی وہی
ہاں اک بجھی بجھی سی چمک چشمِ نم میں ہے
یہ لمحہ جس کے سحر میں کھوئے ہوئے ہیں ہم
کتنی مسرتوں کا سرور، اس کے غم میں ہے

حریفِ وصال

عجیب شب تھی
جو ایک پل میں سمٹ گئی تھی
عجیب پل تھا
جو سال ہا سال کی مسافت پہ پرفشاں تھا
اور اس کے سائے میں ایک موسم ٹھہر گیا تھا
(کسی کے دِل میں تھا کیا، کسی کو خبر نہیں تھی)

بس ایک عالم سپردگی کا
بس ایک دریائے تشنگی تھا کہ جس کی موجیں
امڈ امڈ کر بکھر رہی تھیں
کھلے سمندر میں ڈوب جانے کی آرزو میں مچل رہی تھیں

خیال ۔ حُسنِ خیال میں گم
نگاہ ۔ خوابِ جمال میں گم
نہ جانے کس خواب کی یہ تعبیر تھی کہ آنکھوں میں جاگتی تھی
نہ جانے کس آرزو کی تکمیل ہو رہی تھی
کہ آنکھ سے آنکھ
لب سے لب محوِ گفتگو تھے
مگر بس اک بات معتبر تھی
کسی کے دِل میں تھا کیا، کسی کو خبر نہیں تھی

وہ لمحہ گزرا کہ سحر ٹوٹا
یکایک احساسِ عمر جاگا
ہر ایک چہرہ خود اپنی آنکھوں میں آئینہ ہو گیا ہو جیسے
طلسمِ سم سم سے جس خزانے کا دَر کھلا تھا
وہ یک بہ یک کھو گیا ہو جیسے
عجیب تھا ایک چور دِل میں
جو اس خزانے کا پاسباں تھا
جو سائے کی طرح درمیاں تھا

تقاضۂ ماہ و سال تھا وہ ؟
کہ دل کی گہرائیوں میں بیدار۔
کوئی خوفِ مآل تھا وہ ؟
عجیب سا اک خیال تھا وہ
ہجومِ جذبات میں در آیا تھا جو حریفِ وصال بن کر
جو دل کی دھڑکن میں رُک گیا تھا، ضمیر کا اک سوال بن کر

دوسرا تجربہ

کل شب، عجیب ادا سے تھا اک حُسن مہرباں
وہ شبنمی گلاب سی رنگت ڈھلی ڈھلی
شانوں پہ بے قرار وہ زلفیں کھُلی کھُلی
ہر خطِّ جسم پیرہنِ چُست سے عیاں
ٹھہرے بھی گر نگاہ تو ٹھہرے کہاں کہاں
ہر زاویے میں حُسن کا اک تازہ بانکپن
ہر دائرے میں کِھلتے ہوئے پھُول کی پھبن
آنکھوں میں ڈولتے ہوئے نشّے کی کیفیت
روئے حسیں پہ ایک شکستہ سی تمکنت
ہونٹوں پہ اَن کہی سی تمنّا کی لرزشیں
بانہوں میں لمحہ لمحہ سمٹنے کی کاوشیں

سینے کے جزر و مد میں سمندر سا اضطراب
اُمڈا ہوا سا جذبۂ بیدار کا عذاب
خوشبو طوافِ قامتِ زیبا کیے ہوئے
شیشہ بدن کا، عزمِ زلیخا لیے ہوئے
پھر یوں ہوا کہ چھڑ گئی یوسف کی داستاں
پھر میں تھا اور پاکیٔ دامن کا امتحاں
اک سانپ[1] بھی تھا آدم و حوّا کے درمیاں

---

[1] انجیل کی روایت ہے کہ شیطان نے سانپ کی شکل میں آدم و حوّا کو ورغلایا تھا۔ شاعر

منظر و پس منظر

چلتے چلتے ٹھٹک گئے پاؤں
اک دُکاں پر نگاہ جم سی گئی
خشک آنکھوں میں برق سی تڑپی
دل کی دھڑکن مچل کے تھم سی گئی

رنگ رنگ آبدار ملبوسات
جیسے نظروں کے سامنے منشور
تہہ بہ تہہ آئینوں میں قوسِ قزح
کتنی نزدیک اور کتنی دُور

ساریاں جیسے سطحِ آبِ رواں
ساریاں جیسے کہکشاں لہرائے
ساریاں جیسے چاندنی لبِ جُو
ساریاں جیسے گلستاں لہرائے

چھوٹے چھوٹے سے شیش محلوں میں
حُسنِ فطرت، جمالِ فن محدود
یہ تجارت، یہ اِرتقا کا کمال
کائنات اک دکاں پہ سربسجود

ایک شوکیس میں بنارس قید
ایک شوکیس محبسِ کشمیر
ایک شوکیس، اک حسیں زنداں
برِاعظم سے تا بہ برِصغیر

اُس کی ظلمت زدہ نگاہوں میں
اِن حقائق کی اک کرن بھی نہ تھی
جانے کیا سوچتی رہی وہ غریب
اُس کے ماتھے پہ اک شکن بھی نہ تھی

وہ کھڑی دیکھتی رہی چُپ چاپ
جگمگاتے ہوئے جہان پرائے
آرزوؤں کے رنگ محلوں میں
اجنبی جنّتوں کے خواب سجائے

وہ کھڑی دیکھتی رہی چُپ چاپ
خشک آنکھوں میں سیلِ اشک چھپائے
ہڈّیوں کے نحیف سینے میں
دل کی بے نام خواہشات دبائے

وہ کھڑی دیکھتی رہی چُپ چاپ
زندگی کی عجیب تصویریں
اِس اُجالے میں ڈھونڈھتی ہی رہی
اپنے خوابوں کی شوخ تعبیریں

یک بہ یک ایک کار آ کے رکی
یک بہ یک ایک برق سی لہرائی
یک بہ یک تن گئی فضا میں دھنک
ایک عورت دُکاں کے اندر آئی

ایک عورت کہ یاسمن کی بیل
ایک عورت کہ چلتی پھرتی برق
ایک عورت کہ چاندنی میں تاج
ایک عورت کہ اپنی آب میں غرق

وہ کھڑی دیکھتی رہی چُپ چاپ
جگمگاتی دُکاں سے کار تلک
کتنی یکساں تھی، کتنی ہم آہنگ
قہقہوں اور روپیوں کی کھنک

خشک آنکھوں میں بجلیاں پیہم
ناچتی، کوندتی، لپکتی رہیں
کار میں قہقہے سمٹ بھی گئے
خشک آنکھیں پلک جھپکتی رہیں

وہ کھڑی دیکھتی رہی چُپ چاپ
زندگی کے نشیب اور فراز
قصرِ محمود سے ہے کتنی دُور
گرد آلود رہگذارِ ایاز

وہ خدیجہؓ ہو یا کہ سیتا ہو
کوئی کعبہ ہو یا صنم خانہ
آرزوؤں ہی سے عبارت ہے
زندگی کا حسین افسانہ

گرد آلود پاؤں اُٹھنے لگے
دل میں طوفانِ حشر خیز دبائے
آرزوؤں کے کانپتے تابُوت
تھرتھراتی پلک پلک پہ اُٹھائے

وہ چلی تو گئی مگر چُپ چاپ
نظمِ دوراں کا وزن تول گئی
کتنی اوجھل حقیقتوں کے راز
اہلِ فکر و نظر پہ کھول گئی

۱۹۵۳ء

آتش کدہ ہے سینہ مرا، رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

غالبؔ

حرف حرف روشنی

(ایک طویل نظم)

سنہ ۱۹۷۴ء

(اپنے بچّوں کی معرفت)
نئی نسل کے نام

۱

مرے لہو کے چراغو ۔ مرے جگر پارو
سنو، یہ میری نصیحت بھی ہے، وصیّت بھی

میں آج تم میں ہوں موجود، کل نہیں ہوں گا
مگر جو تم ہو، تو میں ہوں سدا سلامت بھی

تم اپنا نقطۂ آغاز ہی سہی، لیکن
تمھارے ساتھ رواں ہے مری روایت بھی

میں اپنے ماضیِ مرحوم کی امانت تھا
سو آج تم سے ہے منسوب یہ امانت بھی

مجھے جو غم ہے تو اتنا کہ اپنے ہی گھر میں
تمھارا ورثہ ہے، میرا عذابِ ہجرت بھی

۲

مرے لہو کے چراغو ۔ مرے جگر پارو
تم اس عذاب کو اک امتحاں سمجھ لینا

تم اپنے غم کا نہ دینا زمین کو الزام
کوئی یقیں بھی دلائے، گماں سمجھ لینا

وطن کے نام پہ کوئی زیادتی ہو اسے
عنایتِ نگہہِ دوستاں سمجھ لینا

یہ جبرِ وقت بھی تاریخ کا تقاضہ ہے
اسے بھی مرحلۂ قرضِ جاں سمجھ لینا

جو کوئی پُوچھے تمھارا حسب نسب کیا ہے
تو میرے نام کو حرفِ زیاں سمجھ لینا

۳

مرے لہو کے چراغو — مرے جگر پارو
میں آج اپنی کہانی سُنا رہا ہوں تمھیں

وہ راز جو مرے سینے میں دفن تھا اب تک
وہ راز اب سرِ محفل بتا رہا ہوں تمھیں

وہ خواب جس کی حقیقت ہے عالمِ سکرات
میں ایسے خوابِ گراں سے جگا رہا ہوں تمھیں

تم اپنی آنکھ سے دیکھو خود اپنے چہرے کو
کہ آج اپنا بھی چہرہ دکھا رہا ہوں تمھیں

وہ حرفِ حق جو سُنایا نہیں گیا تم کو
سنو کہ پہلے پہل میں سُنا رہا ہوں تمھیں

۴

مرے لہو کے چراغو — مرے جگر پارو
دروغ و مکر کا انبار ہے مری تاریخ

برائے نام خدا ہے، برائے نام ہے دیں
خدا و دیں کی گنہگار ہے مری تاریخ

نہ آدمی کی حقیقت نہ زندگی کا سراغ
فقط قصیدۂ دربار ہے مری تاریخ

فقیہہ و شاعر و فن کار — سب وظیفہ خوار
غلام فکر کا بیوپار ہے مری تاریخ

جو آج "شاہی محلہ" ہے کل یہی تھا "حرم"
حقیقتاً پسِ دیوار ہے مری تاریخ

لے لاہور کا ایک چکلہ — ہیرا منڈی

۵

مرے لہو کے چراغو ــــ مرے جگر پارو
تمھیں گمان کہ دیں دار تھے بہت اسلاف

وفا شعار، محبِّ وطن، غریب نواز
عمل میں صاحبِ کردار تھے بہت اسلاف

حقیقتِ پسِ پردہ، بتاؤں کیسے تمھیں
نشے میں اپنے ہی سرشار تھے بہت اسلاف

بدلتے وقت کے تیور کو بھانپ لیتے تھے
ہر اک گھڑی سے خبردار تھے بہت اسلاف

زمیں کی چاہ میں، جاگیر کے تصور میں
بس اپنے شاہ کے غم خوار تھے بہت اسلاف

۶

مرے لہو کے چراغو ــــ مرے جگر پارو
عجب حکایتِ مذموم ہے یہ افسانہ

خبر نہیں ہے کہ بین السطور میں کیا ہے
کچھ اتنا سادہ و معصوم ہے یہ افسانہ

ہجومِ لفظ میں اک حرفِ حق نہیں ملتا
صدائے حق سے بھی محروم ہے یہ افسانہ

یہ اور بات، مرے لوگ باشعور نہیں
جبینِ وقت پہ مرقوم ہے یہ افسانہ

مورخین اسے کوئی رنگ دیں، لیکن
مرے خدا کو تو معلوم ہے یہ افسانہ

۷

مرے لہو کے چراغو — مرے جگر پارو
میں ابتدا سے سناؤں یہ داستانِ عجیب

وہ آریائی تمدن ہو یا کہ سامی ہو
وہ غوریوں کی حکومت ہو یا مغل تہذیب

مری زمین کو جس نے بھی دل سے اپنایا
سمجھ لیا اُسے اہلِ وطن نے اپنا حبیب

بڑی کتابیں جو لکھی گئیں کہ اُتری ہوں
اُنھیں سنبھال کے رکھا ہے اپنے دل کے قریب

عجب تھی تشنگیِ علم میرے لوگوں کی
ہر ایک علم ہے سینے میں آج بالترتیب

۸

مرے لہو کے چراغو — مرے جگر پارو
ورود کا یہ عمل بھی مگر ہے غور طلب

کسی نگاہ میں تھی اِس زمیں کی زرخیزی
حصولِ زر تھا کہیں حملہ آوری کا سبب

کسی کو دیں سے محبت نہ فکر و فن سے پیار
کسی نے آ کے نہ پرکھا یہاں کا علم و ادب

جو چند لوگ کہیں تھے بھی اہلِ دل تو انھیں
زبان کھولنے دیتا نہ حکمراں کا غضب

ہو جوگیوں کی تپسیا کہ صوفیوں کا عمل
رہا ہے سینہ بہ سینہ بہ حرفِ زیرِ لب

۹

مرے لہو کے چراغو — مرے جگر پارو
تم اپنے دیس کی مٹی اُٹھا کے دیکھو تو

ہر ایک ذرّہ ہے اپنے لہو میں ڈوبا ہوا
حنا سے اپنی ہتیلی سجا کے دیکھو تو

حرم سرا ہو کہ دربار ہو کہ راج بھون
سبھی ہیں ایک، یہ دیوار ڈھا کے دیکھو تو

وہی وزیر، وہی منتری، وہی سالار
کسی کا چہرہ کسی پر لگا کے دیکھو تو

کہیں زمین سے ملتا نہیں کنارِ فلک
بلندیوں پہ بہت دُور جا کے دیکھو تو

۱۰

مرے لہو کے چراغو — مرے جگر پارو
وہ لوگ اور تھے جن سے ہے یہ زمیں روشن

وہ برہمن تھے نہ مُلّا نہ جوتشی نہ فقیہہ
وہ عام لوگ تھے جن کا دلوں میں تھا مسکن

وہی، جنھوں نے بُتانِ حروف کے بدلے
دلِ بشر کو بنایا حیات کا مخزن

خدا کو قیدِ معابد سے دے کے آزادی
وسیع کر دیا اس کائنات کا دامن

زمیں گواہ کہ وہ خاک بھی مقدّس ہے
جہاں جہاں بھی ہیں اُن اہلِ درد کے مدفن

۱۱

مرے لہو کے چراغو — مرے جگر پارو
تمہیں خبر ہے کہ انساں ہے خواہشات کا نام

جو خواہشات ہوں پوری تو یہ جہاں، فردوس
وگرنہ مرگِ مسلسل ہے اِس حیات کا نام

خیال و خواب ہوں آزاد تو قفس بھی چمن
جو ہوں اسیر تو زنداں ہے کائنات کا نام

مگر یہ فلسفہ کیا ہے، یہ فلسفہ کیوں ہے
کہ زندگی کا ہے اثبات، قطعِ ذات کا نام

عوام کو یہ عقیدہ دیا گیا ہے کیوں
کہ قتلِ نفس ہے اک دائمی نجات کا نام

۱۲

مرے لہو کے چراغو — مرے جگر پارو
یہ نکتہ غور طلب بھی ہے، گفتنی بھی ہے

تمام عیش تجمّل حسین خاں کے لئے
مگر ہو خواہشِ غالب تو کشتنی بھی ہے

عوام کے لئے ہر اک شجر ہے ممنوعہ
خواص کے لئے اللہ بڑا غنی بھی ہے

غریب ہو تو وہ قسمت کا بھی غریب مگر
امیر ہو تو وہ تقدیر کا دھنی بھی ہے

فقیہہِ شہر کی اِس دو رخی نے سمجھایا
ہزار چہرہ ہو راون، شکستنی بھی ہے

۱۳

مرے لہو کے چراغو — مرے جگر پارو
میں مانتا ہوں کہ ہر عہد خام ہوتا ہے

ہر اک زمانہ ہے اک حدِ فکر کا پابند
اور اس کی زد میں ہر اک خاص و عام ہوتا ہے

ہر ایک لمحے کی تکمیل دوسرا لمحہ
یہ وقت کا ہے سفر، کب تمام ہوتا ہے

بس اک کشاکشِ اضداد ہے کہ جاری ہے
قیام ہے جو بظاہر، خرام ہوتا ہے

وہ فلسفہ جو حقیقت نگر نہیں ہوتا
تو اس کا ردِ عمل، انتقام ہوتا ہے

۱۴

مرے لہو کے چراغو — مرے جگر پارو
زوالِ بادشہی ہے، زوالِ فکرِ قدیم

وہ جبر و قدر کے اسرار، وہ رموزِ عدم
وہ ماورائے حقیقت، مجاز کی تفہیم

یہ زندگی ہے قفس اور موت آزادی
وہ لامکاں میں طلسمِ حیات کی تجسیم

حقیقتوں سے زیادہ وہ عکس پر اصرار
وہ آدمی سے سوا اس کے سائے کی تعظیم

جنون و عشق پہ ایمان اور خرد سے گریز
یہی تھا اپنے اب وجد کا ورثۂ تعلیم

۱۵

مرے لہو کے چراغو — مرے جگر پارو
تغیرات کی زد میں ہے زندگی کا نظام

ہر اک عمل کا مقدر ہے ایک ردِّ عمل
ہر ایک صبح کی تقدیر میں لکھی ہے شام

ہر ایک مظہرِ فطرت ہے آدمی کا رفیق
ہر ایک لوح پہ کندہ ہے آدمی کا نام

زمیں کو اہلِ سیاست نے کر دیا تقسیم
وگرنہ اہلِ زمیں میں ہے کوئی خاص نہ عام

یہ شرق و غرب، سفید و سیاہ، پست و بلند
ہر ایک فرق سے بالا ہے آدمی کا مقام

۱۶

مرے لہو کے چراغو — مرے جگر پارو
یہ عہد، عہدِ خرد ہے، بہ فیضِ حسنِ عمل

گمان و وہم کے سارے طلسم ٹوٹ گئے
کہ آدمی ہی ابد ہے اور آدمی ہی ازل

نہ وہ جہان عدم ہے وجود کا مامن
نہ یہ جہان حسیں ہے حیات کا مقتل

خدا بھی ہے تو وہیں ہے، جہاں ہیں ہم آباد
نظر میں وہ بھی ہے موجود، جو ہے آنکھ اوجھل

یہ وقت کا ہے تسلسل، طلوع ہو کہ غروب
یہ اک عمل کا تواتر ہے، زیست ہو کہ اجل

۱۷

مرے لہو کے چراغو — مرے جگر پارو
تمھیں زمین پہ رہنا ہے آسماں کی طرح

سمیٹنا ہے ہر اک غم کو اپنے دامن میں
کشادہ ظرفیِ قلبِ پیمبراں کی طرح

ملا ہے جو بھی تمھیں میری زندگی کے عوض
عزیز رکھنا ہے اپنی متاعِ جاں کی طرح

یہ رہگذر جو بچھی ہے تمھارے قدموں میں
بصد خلوص کسی نیک میزباں کی طرح

اسی وطن کی عطا ہے، اسی وطن کا کرم
جنم دیا ہے تمھیں جس نے ایک ماں کی طرح

۱۸

مرے لہو کے چراغو — مرے جگر پارو
تم اب جہاں بھی رہو آباد اسی زمیں پہ رہو

جو اس زمیں کا ہے ماضی وہی تمہارا ہے
وہی تمہاری ہے تاریخ، تم کہیں پہ رہو

شجر کا رشتہ جڑوں سے تو کٹ نہیں سکتا
جہاں جہاں بھی اُگے ہو، وہیں وہیں پہ رہو

تمہاری خاک بھی اِس خاک ہی کا حصہ ہے
تم اپنی خاک میں مِل جاؤ گے یہیں پہ رہو

خیال و خواب کی باتیں، فسانہ و افسوں
یقیں ہے اصل حقیقت، سدا یقیں پہ رہو

۱۹

مرے لہو کے چراغو ۔ مرے جگر پارو
ہر ایک ارضِ وطن کی یہی کہانی ہے

ہر اک زمین کا ہوتا ہے اپنا ایک ازل
وطن نیا سہی، تہذیب تو پرانی ہے

سراغ ملتا ہے تاریخ سے صداقت کا
یہ راز ایک حقیقت ہے اور زمانی ہے

یہ رمز وحدتِ اقوام میں ہے پوشیدہ
جو اپنے ربط سے ٹوٹی وہ قوم فانی ہے

ہزار گردشِ افلاک ہو، پہ گردشِ خوں
ازل سے جاری و ساری ہے، غیر فانی ہے

۲۰

مرے لہو کے چراغو ۔ مرے جگر پارو
پلٹ کے دیکھو، تو شاید زمانہ دکھلائے

وہ شہر جس نے تمھیں زندگی عطا کی ہے
وہ گھر کہ جس کے تصوّر سے تم کو نیند آئے

وہ پیڑ (ماؤں کے مانند) سائے میں جن کے
بھری دوپہر میں کچھ دیر تم بھی سستائے

وہ لوگ جن کی محبت کی تم نشانی ہو
وہ راستے جو تمھیں اپنے عہد تک لائے

وہ دور جس کے تسلسل کی اک کڑی ہو تم
تمھارے سامنے ہے آج ہاتھ پھیلائے

۲۱

مرے لہو کے چراغو مرے جگر پارو
یہ ہاتھ ہاتھ میں لے لو کہ ہیں یہ پیار کے ہاتھ

ہزاروں سال کی بچھڑی ہوئی محبت کے
کسی کی یاد میں خاموش انتظار کے ہاتھ

خزاں کی راہ میں سرمایۂ نمو لے کر
گلوں کی آس میں بے رنگ شاخسار کے ہاتھ

ہوا کا جھونکا ہی شاید کوئی خبر لائے
کسی کی چاپ پہ رُکتی ہوئی بہار کے ہاتھ

یہ ہاتھ چھوڑ نہ دینا اگر زمیں ہے عزیز
کہ ان سے بڑھ کے نہیں کوئی اعتبار کے ہاتھ